چند روز میں محمدؐ عاقل نے باپ کا سب کام اُٹھا لیا اور رئیس کو اپنی خدمت سے بہت خوش کیا تب مولوی صاحب نے رئیس سے کہا۔ کہ یہ لڑکا اب حضور کی خدمت میں حاضر ہے مجھ کو آزاد فرمائیے ؎

رسمت کہ مالکانِ تحریر
آزاد کنند بندۂ پیر

رئیس کا دل بڑا سخی تھا۔ بیس روپیہ تاحیات مولوی صاحب کی پنشن کر دی اور مولوی صاحب کی جگہ محمدؐ عاقل کو پوری تنخواہ پر رکھ لیا۔

اصغری دہلی میں آئی تو اُس نے محمودہ کی فکر کی۔ حُسن آرا مجھ سے اپنے گھر آئی ہوئی تھی۔ اور اُنھیں دنوں جمال آرا بھی سُسرال سے چھوٹی بہن سے ملنے آئی تھی۔ حکیم جی کا تمام گھر تو اصغری کا مُرید تھا۔ دونوں بہنیں اصغری کے آنے کی خبر سُن کر دوڑی آئیں۔ ہر طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔

جمال آرا نے کہا۔ اُستانی جی کیسا جی تم میں پڑا تھا کہ بیان نہیں ہو سکتا بھلا حُسن آرا تو تمھاری شاگرد ہیں لیکن میں شاگردوں سے بھی زیادہ ہوں۔ میرا اجڑا ہوا گھر تمھیں نے بسوایا۔

اصغری نے کہا۔ میں کس لائق ہوں۔

جمال آرا نے کہا۔ واہ اُستانی جی میں تو جیتے جی تمھارا سلوک نہیں بھولوں گی اور کیا کروں تم ہم لوگوں کی خدمت کسی طرح قبول نہیں کرتیں۔ نہیں تو اپنی کھال کی جوتیاں تم کو بنوا دیتی۔ تب بھی شاید تمھارا

حق ادا نہ ہوتا۔

اصغری نے کہا۔ اوّل تو کچھ خدمت مجھ سے نہ بن پڑی اور باقتضائے سرداری کوئی کام آپ کو پسند ہوا تو بیگم صاحب آپ کو خدا نے سب قابل بنایا ہے ہم غریبوں کا خوش کر دینا کون بڑی بات ہے؟

حُسن آرا بولی۔ اے ہے، اُستانی جی تم اپنے منھ سے کیسی بات کہتی ہو؟

اصغری نے کہا۔ سنو، بوا، حُسن آرا! اُستانی گری اور شاگردی تو اب باقی نہیں۔ وہ مکتب تک تھی۔ اب اللہ رکھے تم بیاہی گئیں۔ ادھر تم پوتڑوں کی امیر اور امیروں کی سرتاج، اُدھر یہ سردار اور سرداروں کی بیٹی بہو۔ اب اس شہر میں تم سے بڑھ کر تو دوسرا امیر نہیں۔ تم تک پہنچکر جو آدمی محروم رہے تو اُس کی قسمت کا قصور ہے۔

حُسن آرا نے کہا۔ اچھی اُستانی جی! کیا بات ہے؟

اصغری نے کہا۔ بوا! بڑا مشکل کام ہے تم وعدہ کرو کہ مجھ کو نا اُمید نہ کرو گی تو میں کہوں۔

حُسن آرا، اور جمال آرا نے جانا کسی کی نوکری چاکری کے واسطے کہینگی دونوں نے کہا۔ استانی جی خدا کی قسم تمھارے واسطے ہم دل و جان سے حاضر ہیں۔ لو ہم کو بڑی تمنا ہے کہ تم ہم سے کچھ فرمائش کرو۔

اصغری نے کہا۔ وہ کام میرے نزدیک تو بڑا ہے لیکن اگر آپ دونوں صاحب دل سے آمادہ ہوں تو کچھ بڑا نہیں۔

دونوں بہنوں نے کہا۔ اُستانی جی! خدا جانتا ہے ہمارے کرنے کا کام ہو تو ہم کو ہرگز دریغ نہیں۔

جب خوب پکّا وعدہ کرالیا تو اصغری نے کہا۔ میری یہ آرزو ہے کہ محمودہ کو اپنی فرزندی میں قبول کرو۔

یہ سُن کر دونوں بہنوں نے سکوت کیا۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ جب دونوں اُٹھنے کو ہوئیں تو اصغری نے ایک ہاتھ سے حُسن آرا کا دوپٹہ پکڑا اور دوسرے ہاتھ سے جمال آرا کا۔ اور کہا کہ اب میں اپنا حق لڑ جھگڑ کر لوں گی۔ اور جب تک میرا سوال پورا نہ ہوگا، خدا کی قسم جانے نہ دوں گی۔

حُسن آرا نے کہا۔ اُستانی جی بھلا اس میں ہمارا کیا اختیار ہے ابھی تو ارجمند خاں لڑکا ہے۔ دوسرے ایسی باتوں میں ماں باپ کے ہوتے بہنوں کو کیا دخل۔

اصغری نے کہا۔ بڑی اور بیاہی ہوئی بہنیں بھی ماں کے برابر ہوتی ہیں اور رشتے ناتے بے سب کی صلاح کے نہیں ہوتے۔ ایسا ممکن نہیں ہے کہ تم سے مشورہ نہ ہو۔

حُسن آرا نے کہا۔ ابھی ہمارے یہاں تو کچھ ذکر مذکور کہیں کا نہیں ہے۔

اصغری نے کہا۔ تم کو معلوم نہ ہوگا۔ علوی خاں کے یہاں رقعہ گیا تھا واپس آیا۔

جمال آرا نے کہا۔ اُستانی جی! تم نے سُنا ہے تو گیا ہوگا مگر ہم سے اس معاملہ میں کچھ بات نہیں ہوئی۔ علوی خاں میں کیا بُرائی تھی؟ خدا جانے رقعہ پھروا کیوں لیا؟

اسی طرح بات میں بات اور ہونے لگی۔ اصغری نے کہا۔ صاحبو! میرا مطلب رہا جاتا ہے۔ ہاں نا کا جواب مجھ کو دیجئے۔

جمال آرا نے کہا۔ اُستانی جی! بھلا ہم کیونکر ہامی بھر سکتے ہیں؟

اصغری نے کہا۔ دولت، سیرت، صورت تین چیزیں ہوتی ہیں۔ دولت تو ہم غریبوں کے پاس نام کو نہیں۔ رہی سیرت سو بوا! حُسن آرا، تم محمودہ سے بخوبی واقف ہو۔ دو برس تمہارا اُس کا ساتھ رہا۔ تم سچ کہنا۔ شرم لحاظ، ادب قاعدہ، نیک بختی، ہر کام کا سلیقہ، اور ہر طرح کا ہنر، لکھنا، پڑھنا، سینا، پرونا، پکانا، یہ سب باتیں محمودہ میں ہیں یا نہیں؟ کچھ اس پر موقوف نہیں ہے کہ محمودہ میری نند یا میری شاگرد ہے۔ نہیں وہ لڑکی کچھ خدا نے بہر صفت موصوف پیدا کی ہے۔ کیوں بوا حسن آرا! میں جھوٹ کہتی ہوں؟ تو تم بولو۔

حسن آرا نے کہا۔ اُستانی جی! بھلا چاند پر کوئی خاک ڈال سکتا ہے؟ محمودہ بیگم ماشاء اللہ بڑے گھروں میں اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ بھلا کوئی محمودہ بیگم کا پاسنگ تو ہو۔

اصغری نے کہا اور صورت، سوناک، کان، آنکھ جیسے آدمی میں ہوتے

ہیں محمودہ میں بھی ہیں۔ وہ بھی آدمی کا بچّہ ہے۔ جوان ہونے پر کچھ اس سے زیادہ صورت نکل آئے گی۔

جمال آرا بولی۔ اَے اُستانی جی! محمودہ بیگم کو آدمی کا بچّہ کہتی ہو، خدا کی قسم حور کا بچّہ ہے۔ بڑے گھروں میں اونچی دُکان پھیکا پکوان ہم نے تو کوئی صورت دار نہ دیکھا۔ ہم دونوں بہنیں موجود ہیں۔ خدا کی قسم بعض لونڈیاں ہم سے اچھی ہیں اور محمودہ تو چندے آفتاب اور چندے ماہتاب اس صورت کے آدمی کہاں نظر آتے ہیں؟

اصغری نے کہا۔ پھر بواسوائے غریبی کے اور ہم میں کیا بُرائی ہے اگرچہ چھوٹا مُنھ بڑی بات ہے لیکن علی نقی خاں مرحوم کو دو چار پشتیں نہیں گزریں۔ آخر ہم بھی انھیں کے نام لیوا ہیں۔

دونوں بہنوں نے کہا۔ اُستانی جی! تم ہماری مہتاج ہو اور ہم اور تم کیا دو دو ہیں ایک ذات ایک خون۔

اصغری نے کہا۔ پھر کیا تامّل ہے۔ میری درخواست کو قبول فرمایئے۔

حُسن آرا نے کہا۔ اچھا استانی جی! آج ہم اس بات کا مذکورہ اماں سے کریں گے۔

اصغری نے کہا۔ مذکور نہیں۔ مذکور تو میں بھی کر سکتی ہوں۔ بلکہ دل سے اس میں مدد کرو اور اب یہ بات چھڑی ہے تو ایسا ہو کہ پوری ہو جائے۔

دونوں بہنوں نے وعدہ کیا کہ اُستانی جی جیسا آپ کا ارادہ ہے انشاء اللہ ویسا ہی ہوگا۔

غرضکہ اس وقت دونوں بہنیں رخصت ہو گئیں اگلے دن اصغری خود سلطانہ بیگم سے ملنے کو گئی۔ دو تولہ روپے کا بہت عمدہ شالی رومال جو سیالکوٹ سے لائی تھی سلطانہ بیگم کو نذر دیا۔

سلطانہ بیگم نے کہا۔ اُستانی جی تم ہم کو بہت شرمندہ کرتی ہو؟ ہم کو تمھاری خدمت کرنی چاہیئے۔ نہ کہ الٹا تم سے لیں۔

اصغری نے کہا، یہ رومال میں نے صرف آپ کے واسطے فرمائش کر کے بنوایا اور اس کو آپ قبول فرمایئے۔ ڈیڑھ برس سے اسی اُمید میں میری گٹھری میں بندھا تھا کہ دہلی چل کر میں خود پیش کروں گی۔

سلطانہ بیگم نے کہا۔ میں اس کو بطور تبرک کے لئے لیتی ہوں لیکن مجھ کو خدا کی قسم شرم آتی ہے۔ کبھی آپ نے بھی تو کچھ فرمائش کی ہوتی کہ میرا جی خوش ہوتا۔

اتنا سہارا پا کر اصغری دست بستہ کھڑی ہو گئی اور اپنا مطلب بیان کیا۔

سلطانہ بیگم نے کہا۔ اچھا، اُستانی جی، آپ بیٹھئے تو سہی۔

اصغری نے کہا۔ اب میں اپنی مراد کو لیکر بیٹھوں گی۔

سلطانہ بیگم نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا اور کہا کہ بیٹا بیٹیوں کے کام مشکل کام ہیں۔ کمھار کے یہاں سے دمڑی کا پیالہ لیتے ہیں تو ٹھوک بجا

لیتے ہیں۔ اور یہ تو عمر بھر کی کمائیوں کے بیوہار ہیں۔ سوچ سمجھ کر صلاح مشورہ ہو کر کرنا چاہیئے۔ آپ نے ذکر کیا۔ اب میں اُن کے باپ سے اور اپنی بڑی بہن سے اور کنبے کے اور دو چار آدمیوں سے صلاح کروں پھر جیسا ہوگا دیکھا جائے گا اور ابھی تو ارجمند لڑکا ہے۔ اُس کے بیاہ کی کیا جلدی ہے؟

اصغری نے کہا۔ حوصلہ سے بڑھ کر میں نے سوال کیا ہے جس طرح مصر میں کوئی بڑھیا عورت سوت کی انٹی لیکر حضرت یوسفؑ کی خریدار بنی تھی اسی طرح میرے پاس غریبی اور عاجزی کے سوا کچھ دینے لینے کو نہیں ہے۔ اب صرف آپ کی مہربانی درکار ہے۔

ہر چند سلطانہ بیگم نے زبان سے کچھ نہ کہا لیکن انداز سے معلوم ہوا کہ بات ناگوار نہیں ہوئی۔

چلتے ہوئے اصغری جمال آرا اور حُسن آرا سے کہتی گئی کہ اب اس کا نباہ آپ لوگوں کے اختیار میں ہے۔

اصغری کے جانے کے بعد دونوں بہنوں نے محمودہ کی حد سے زیادہ تعریف کی۔ سلطانہ تو نیم راضی ہوگئی۔

لیکن شاہ زمانی بیگم کی بھی ایک بیٹی تھی دلدار جہاں۔ اور شاہ زمانی کا یہ ارادہ تھا کہ ارجمند سے اپنی بیٹی کی منگنی کرے لیکن اتنا غلیمت تھا کہ ابھی تک شاہ زمانی نے اپنی بہن سے اس کا کچھ

CH. 27

تذکرہ نہیں کیا تھا۔ جب اصغری نے محمودہ کی نسبت کی گفتگو کی تو سلطانہ بیگم نے شاہ زمانی بیگم سے پوچھا بھیجا کہ آپ کے نزدیک یہ بات کیسی ہے؟

شاہ زمانی یہ حال سُن کر بہت گھبرائی اور اس فکر میں ہوئی کہ محمودہ کی بات دب جائے تو دلدار جہاں کی بات ٹھہرا دوں۔ اُس وقت تو کہلا بھیجا کہ میں سوچ کر جواب کہلا بھیجوں گی۔ اگلے دن خود بدولت آموجود ہوئیں۔ اور جب ذکر چلا تو سلطانہ سے کہا کہ کہاں تم، کہاں مولوی صاحب زمین و آسمان کا کیا جوڑ یہ بات یہاں کون لایا تھا؟

سلطانہ نے کہا۔ اُستانی جی۔

شاہ زمانی نے کہا۔ میں خود اُستانی جی کے پاس جاتی ہوں۔

حُسن آرا کو ساتھ لے اصغری کے پاس گئیں اور کہا کہ استانی جی تم اتنی بڑی تو عقلمند اور تم اتنا نہ سمجھیں کہ رشتہ ناتہ برابر کے ساتھ ہوتا ہے علوی خاں کے گھر سے اس بات پر رقعہ پھرا کہ اُنھوں نے سونے کا چمچہ کھٹ نہیں مانا بھلا تم محمودہ کو کیا دوگی؟

اصغری نے کہا بیگم صاحب میں نے تو لڑکی کے بیاہ کے واسطے ایک بات کہدی تھی کچھ لڑکی کے مول تول کا پیام نہیں دیا۔ شہر میں اگرچہ اب کل رسمیں بگڑ گئی ہیں لیکن لینے دینے کا چکوتا کہیں نہیں سُنا۔ جو بیٹی دیگا وہ لیا اٹھا رکھے گا۔ باقی رہی برابری سو ظاہر ہے کہ دولت کے اعتبار سے تو یہاں علوی خاں کا چوتھائی بھی نہیں لیکن آپ تو لڑکا بیاہتی ہیں

آپ کو جہیز کی کیا فکر؟ لڑکی دینی ہو تو انسان یہ بھی سوچ کرے کہ بھائی لڑکی کا گزر دیکھ لو یا کوئی غریب ہو اور بہو کے جہیز پر اُدھار کھائے بیٹھا ہو وہ اس کی فکر کرے تو بجا ہے۔ آپ تو بیٹی لیتی ہیں اور سب کچھ خدا کا دیا ہوا آپ کے یہاں موجود ہے۔ آپ کو تو لڑکی چاہیئے۔ سو لڑکی آپ کی دیکھی ہوئی ہے۔ کوئی حال اُس کا آپ سے مخفی نہیں۔ ذات جو کچھ بُری بھلی ہے آپ کو معلوم ہے

شاہ زمانی نے کہا۔ کیا ہوا پھر بھی جوڑ دیکھ کر بات کی جاتی ہے۔

اصغری نے کہا۔ بیگم صاحب! خطا معاف، اب جوڑ کہاں ہے؟ جوڑ تو اُن دنوں تھا جب علی نقی خاں نے اسی گھر میں بہن کو بیاہ دیا تھا یا یہ وہی گھر ہے کہ بیٹی لینے کے واسطے بھی جوڑ نہیں۔ اب کیا اس گھر میں کیڑے پڑ گئے ہیں؟ دولت نہیں، سو یہ بڑا بول خدا کو نہیں بھاتا۔

اصغری نے شاہ زمانی کو ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ بات نہ بن پڑی، اور شاہ زمانی نے کہا۔ اُستانی جی! تم تو خفا ہوتی ہو؟

اصغری نے کہا۔ بیگم صاحب! میری کیا مجال ہے۔ مجھ کو تو اُمید تھی کہ آپ اس بات میں امداد کیجئے گا، نہ کہ خود آپ ہی کو ناگوار ہے۔

شاہ زمانی نے کہا۔ اُستانی جی! برا مانو یا بھلا جوڑ نہیں ہے۔

اصغری نے کہا۔ دولت میں ہم جوڑ نہیں ہیں۔ ذات میں برابری کا دعویٰ ہے۔ ہنر میں انشاء اللہ وہ ہمارے جوڑ نہ ٹھہریں گے۔ کیا مضائقہ ایک بات میں وہ کم ایک بات میں ہم کم۔ ہماری ایسی بہو دُنیا میں چراغ

لیکر ڈھونڈتی پھریں گی تو نہ ملے گی۔

شاہ زمانی بیگم نے کہا۔ اُستانی جی! اقبال مند خاں کے لڑکے کا رقعہ کیوں نہیں منگواتیں؟

اصغری نے کہا۔ میں نے سُنا تھا کہ آپ کے گھر بات ہو رہی ہے۔ اس سے میں نے خیال نہیں کیا۔ اور رقعوں کی کیا کمی ہے۔ لڑکیوں کو لڑکے بہت اور لڑکوں کو لڑکیاں بہت۔ میں نے تو یہ سوچا تھا کہ ہنر اور دولت کا ساتھ ہے یہ چیز امیروں کے لائق ہے اور امیر اس کے زیبا ہیں۔ بات ٹھہر جائے تو دونوں کے لیے اچھا ہے لیکن اگر منظور نہیں تو آپ دلدار جہاں سے نسبت کر دیجئے۔

شاہ زمانی نے کہا۔ ابھی دلدارہ بچہ ہے اور میرا ارادہ ہے کہ اُس کو غیر جگہ دوں۔ رشتے میں رشتہ بے لطفی سے خالی نہیں ہوتا۔

شاہ زمانی تو یہ کہہ کر رخصت ہوئیں۔ حُسن آرا بیٹھی رہ گئی۔ حالہ نے کہا بھی کہ بیٹا چلو۔ حُسن آرا بولی۔ آپ چلئے میں اُستانی جی سے کئی برس میں ملی ہوں۔ باتیں کروں گی۔

جب شاہ زمانی چلی گئیں تو حُسن آرا نے کہا۔ اُستانی جی! اماں تو راضی ہیں یہی حضرت بات کو بگاڑ رہی ہیں۔ مُنہ سے انکار کرتی ہیں تو کرنے دو ان کا اصل مطلب یہی ہے کہ دلداری بات ٹھہر جائے۔

اصغری نے کہا۔ اب تقدیر کی بات ہے۔ بھلا ان کے ہوتے ہماری کیا اصل ہے لیکن بوا حُسن آرا! میں نے تو کچھ بیجا بات نہیں سوچی

تھی ؟ پیوند میں پیوند ملتا دیکھ لیا تھا۔ تمھارا اتنا بڑا گھر اور اللہ آمین کا ایک لڑکا جو کچھ مال ومتاع ہے سب اُسی کا ہے پس اتنے بڑے کارخانے کے سنبھالنے کو بھی بڑی عقل درکار ہے اور سلیقہ چاہیئے محمودہ غریب گھر کی ہے تو کیا ہے۔ اللہ رکھے حوصلہ دار بڑا سلیقہ امیروں جیسا ہے۔ تمھارے گھر میں اگر کوئی بے سلیقہ آئی اور جہیز کے چھکڑے لائی تو کس کام کے ؟ اُس کو اپنا جہیز کا رکھنا اٹھانا مشکل پڑ جائے گا۔ تمھارے گھر کا انتظام کیا کر سکے گی محمودہ تو ماشاء اللہ ملک کا انتظام کرنے والی ہے پھر بولا حُسن آرا یہ بات سوچنی چاہیئے کہ رشتہ ناتا کس غرض سے ہوتا ہے ؟ دنیا میں جہاں تک ہو سکے میل ملاپ کو بڑھانا چاہیئے۔ گھر کے گھر میں نسبت ناتا کر لیا تو کیا ؟ شادی بیاہ جب کرے غیر جگہ۔

حُسن آرا بولی۔ استانی جی! میں نے اور آپا نے خوب طرح پر اماں سے کہا ہے اور اب یہ سب باتیں اماں سے کہوں گی۔ اُمید تو ہے یہی بات رہے غرض اصغری نے یہ سب پٹی پڑھا کر حُسن آرا کو رخصت کیا۔

وہاں شاہ زمانی نے سلطانہ سے جا کر کہا کہ بوا میں نے تو اُستانی کے منہ پر صاف کہدیا کہ تمھارا اُن کا جوڑ نہیں۔ آدمی کو سمجھ کر بات منہ سے نکالنی چاہیئے لیکن پیچ یہ آپڑا تھا کہ شاہ زمانی اپنے منہ سے اپنی لڑکی کے واسطے نہیں کہہ سکتی تھی۔ شاہ زمانی کے دل میں تو یہ بات تھی لیکن یہ سوچے ہوئے تھی کہ مردوں مردوں میں بات ہو جائے گی۔ اب محمودہ کی بات میں غریبی پر

بڑا اعتراض تھا۔ آخر شاہ زمانی سے الگ ہو کر سلطانہ بیگم نے اپنی دونوں بیٹیوں سے جو صلاح کی تو حُسن آرا نے کہا اماں بات صاف تو یہ ہے کہ خالہ اماں دلدار کے واسطے تجویز کرتی ہیں۔

سلطانہ نے کہا۔ بھلا ارجمند سے بھی تو ہنسی ہنسی میں پوچھو۔

جمال آرا نے بھائی کو بُلایا اور کہا کہ کیوں بھائی تمھاری شادی بیاہ کی تجویز ہو رہی ہے۔ تم بھی تو کچھ بولو۔ دلدار جہاں سے راضی ہو ؟

ماں کے منہ پر تو لحاظ کے سبب ارجمند کچھ نہ بولا لیکن اشارے سے اپنی بہنوں سے انکار کیا۔

اس کا انکار جمال آرا و حُسن آرا کو حجت ہو گیا۔ حُسن آرا نے کہا۔ صورت شکل ہنر سلیقہ یہ باتیں تو محمودہ کے پاسنگ بھی کسی لڑکی میں نہ ملیں گی اس کا ذمہ تو میں کرتی ہوں۔ ہاں چاہو کہ سونے کا چھپر گھٹ ملے سو یہ ان بیچارے غریبوں کے پاس کہاں ؟

سلطانہ بولی۔ بوا! اصل تو لڑکی کا دیکھنا ہے۔ خدا کے فضل سے ہمارے گھر میں خود کسی چیز کی کمی نہیں ہم کو بھاری جہیز لیکر کیا کرنا ہے ؟

جمال آرا نے کہا پھر کیا تامل ہے۔ بسم اللہ کیجئے۔

حسن آرا نے کہا۔ گو غریبی ہے لیکن اُستانی جی بڑی چلن کی آدمی ہیں منہ سے نہیں کہتیں تو کیا ہے۔ دقت پر حیثیت سے بڑھ کر کریں گی۔

سلطانہ نے کہا۔ اچھا تمھارے ابا آلیں تو اُن سے بھی صلاح پوچھی جائے۔

چھوٹے حکیم صاحب آئے تو جمال آرا اور حسن آرا نے محمودہ کے مقدمہ کو اس طرح پیش کیا جیسے کچہری میں وکیل اپنے موکل کے مقدمہ کو پیش کرتے ہیں۔ غرض چھوٹے حکیم صاحب نے بھی محمودہ کی بات کو پسند کیا۔

اب دونوں بہنیں، بے تحاشا اصغری کے پاس دوڑی گئیں۔

محمد کامل کی ماں کو اصلا ان باتوں کی خبر بھی نہ تھی۔ انھوں نے پوچھا بھی کہ کیا ہے؟ بیگم صاحب! اس طرح کیوں دوڑتی ہو؟ پائنچے تو اُٹھا کر چلو۔

حسن آرا نے کہا۔ کچھ نہیں۔ اُستانی جی کے پاس جاتے ہیں۔

اصغری کے پاس جاتے ہی حسن آرا نے کہا۔ لیجئے اُستانی جی مبارک، ہمارا انعام دلوایئے۔

اصغری نے کہا۔ خدا تم سب صاحبوں کو بھی مبارک کرے اور انعام دینے کا میرا کیا منھ ہے۔ انعام ہے، دُعا۔ سو شبانہ روز میں تمھاری دُعا گو ہوں۔

حسن آرا نے کہا۔ نہیں اُستانی جی۔ ہم تو آج اپنا منھ ضرور میٹھا کرائیں گے۔

اصغری نے کہا۔ بیٹھے بیٹھے مٹھائی کھائے گا۔

دیانت کو بُلایا اور پانچ روپے نکال اُس کے ہاتھ دیے اور کہا۔ گھنٹے والے کی دُکان سے بہت عمدہ قلاقند اور دریبے کے نکڑ سے پیٹھے کی مٹھائی اور شاہ مدار کی گلی سے موتیا پاگ اور چاندنی چوک سے لوزات اور

نیل کے کٹرے سے گھی کی تلی دال اور خانم کی بازار سے نمش ابھی جا کر لاؤ، اتنے میں دونوں کو گلوریاں بنا کر دیں اور مٹھائی کی ٹوکری آموجود ہوئی۔ اصغری، اکبری، حسن آرا، جمال آرا سب نے مل کر خوب کھائی اور جو بچی مکتب میں بھیجدی۔

اب چلتے ہوئے اصغری نے کہا۔ اس وقت تک میں نے اماں جان کو خبر نہیں کی تھی اب اُن سے تذکرہ کر کے انشاء اللہ پرسوں اچھی تاریخ اور اچھا دن ہے معمولی رسم ادا ہو جائے۔

یہ دونوں تو رخصت ہوئیں۔ اصغری نے ساس سے کہا۔ اماں جان! کچھ محمودہ کی بھی فکر ہے۔

ساس بولیں۔ کیا فکر کروں۔ کہیں سے بات بھی آئے۔ میں ایک جگہ سوچی بیٹھی ہوں۔ محمد صالح کے ساتھ محمودہ کا بیاہ کر دوں گی۔

اصغری نے کہا۔ کجا محمد صالح! اور کجا محمودہ۔ بھائی محمد صالح کی عمر بھائی جان سے کچھ ہی کم ہو گی۔

محمد کامل کی ماں بولیں۔ ہاں عاقل ساڑھے چار برس محمد صالح سے بڑا ہے۔ صرف اتنی ہی چھوٹائی بڑائی ہے۔

اصغری نے کہا۔ بھلا پھر تھوڑا فرق ہے؟

محمد کامل کی ماں نے کہا۔ اور تو کہیں سلام و پیام نہیں۔

اصغری نے کہا۔ میں نے ایک بات سوچی ہے اگر آپ کو پسند ہو تو ذکر چلاؤں

محمد کامل کی ماں نے پوچھا۔ وہ کیا؟

CH. 28

اصغری بولی۔ حکیم فتح اللہ خاں کے لڑکے سے۔

محمد کامل کی ماں بولیں۔ بھلا بیٹی، جھونپڑے کا رہنا اور محلوں کے خواب دیکھنا۔ کجا حکیم جی کا گھر، آج اُن کے یہاں وہ دولت ہے کہ شہر میں اُن کا ثانی نہیں اور کجا ہم غریب کہ رہنے تک کا جھونپڑا بھی درست نہیں یہاں کی بات کیا اُن کی خاطر میں آئے گی ناحق کہکر بھی پشیمان ہونا ہے۔

اصغری نے کہا۔ وہ دولتمند ہیں تو اپنے واسطے ہیں۔ ہم کیا خدا نہ کرے کچھ ان کے دست نگر ہیں وہ اپنے پلاؤ زردے میں مست ہیں تو ہم اپنے دال دلیے میں مگن ہیں، ذات میں ہم اُن سے ہیٹے نہیں ہنر جو ماشاءاللہ ہماری محمودہ میں ہے وہ اُن کے بڑوں میں بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔

محمد کامل کی ماں نے کہا۔ بوا۔ دولت کے آگے ہنر ہاتھ باندھے کھڑا رہتا ہے۔ سونے کا چھپر کھٹ پہلے بنوالوں، تب اُن سے بات کرنے جاؤں ہرگز ہرگز تم اس کا خیال مت کرو۔ اے لو، علوی خاں میں کیا بُرائی تھی؟ جو بھیج کر انھوں نے الٹا منگوالیا۔ بوا، غریبوں کی کھپت غریبوں میں ہو سکتی ہے۔

اصغری نے کہا۔ ہزار دولت کی ایک دولت تو خوبصورتی ہے چشم بد دُور ہماری محمودہ سے بہتر کنبے میں تو ڈھونڈ لیں۔

محمد کامل کی ماں بولیں۔ بوا! تم کیسی لڑکیوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ حُسن بھی ہمسری کی حالت میں پوچھا جاتا ہے اور پھر یہ بات مُنھ سے

کہنے کی ہے کہ ہماری لڑکی خوبصورت ہے اور میں تو نہیں سمجھتی کہ خوبصورتی کیا بلا ہے، بڑی بڑی خوبصورتوں کو دیکھا ہے کہ جوتیوں کے برابر قدر نہیں اور بدشکلیں ہیں کہ لالوں کی لال بنی بیٹھی ہیں۔

اصغری نے کہا۔ خوبصورتی بھی ایسی چیز ہے کہ آدمی اُس پر فریفتہ نہ ہو مگر اکثر آدمی جن کی صورت اچھی ہوتی ہے سیرت کے خراب اور مزاج کے گندے ہوتے ہیں۔ اُن کو اپنی صورت پر ناز ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اُن کی دال نہیں گلنے پاتی۔ اور اُن کا مزاج اُن کے حُسن کی قیمت گھٹا دیتا ہے۔ "اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک گھوڑا ہے رنگ کا صاف ہاتھ پانوں کا اچھا، بال بھونری سے پاک، جوڑبند کا درست۔ لیکن بدرفتار۔ کڑے دولتی الگ چلاتا ہے۔ سواری میں الف ہوتا ہے، الٹ جاتا ہے۔ ایسے نامراد گھوڑے کی صورت لیکر کوئی کیا کرے لیکن اگر پاکیزگی صورت کے ساتھ شائستہ قدم باز اور غریب بھی ہو تو نایاب چیز ہے" جیسے ہماری محمودہ صورت اور سیرت دونوں ماشاءاللہ ایک کا جواب ایک۔

محمد کامل کی ماں نے کہا۔ آخر کچھ دینے کو بھی چاہیئے۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھا رے مکتب کی لڑکی پڑھ رہی تھی ؎

یا مکن با فیلبانا ں دوستی
یا درے افراز بر بالائے پیل

ہم غریبوں کے پاس اُن کی شان کے لائق دینے لینے کو کہاں۔ ناحق بیٹھے

بٹھائے اپنی ہنسی کرانی کیا ضرور ہے۔ اور فرض کیا بات ہو بھی گئی، اور لڑکی وہاں نظروں میں حقیر رہی تو نقصان مایہ و شماتت ہمسایہ۔

اصغری نے کہا۔ عزت اور ذلت کچھ جہیز پر منحصر نہیں۔ میاں بی بی کی موافقت تو اور ہی چیز ہے۔ جمال آرا کیا کم جہیز لے کے گئیں تھیں لیکن ایک دن بھی سسرال میں رہنا نصیب نہ ہوا۔ دور کیوں جاؤ ہماری آپا کو بھی ہمارے برابر ملا تھا۔ پھر کیوں روز لڑائی ہوتی ہے۔ یہ تو اپنا اپنا مزاج اور اپنا اپنا سلیقہ ہے۔

محمد کامل کی ماں بولیں۔ یہ تو میں نے مانا کہ میاں بی بی کا پیار اخلاص جہیز پر موقوف نہیں لیکن کنبے قبیلے کے لوگ بے کہے کب باز آتے ہیں، اور لڑکے نے خیال نہ کیا تو کیا ہے۔ ساس نندیں ہی موقع پا کر کبھی بات میں بات کہہ گزریں آخر دل کو بُرا لگتا ہی ہے۔ ایک تو بیٹی والے کا یوں ہی سر نیچا ہوتا ہے، اُس پر دان دہیز واجبی اور غضب ہے۔ نابود یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔

اصغری نے کہا۔ کنبے والوں سے کیا مطلب؟ کنبے والے ہر روز تھوڑے ہی پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ وہاں ساس نندوں کے رات دن کے طعنے بیشک غضب کا سامنا ہے۔ سو حسن آرا و جمال آرا طعن و تشنیع کا تو کیا ذکر۔ محمودہ کے پاؤں دھو دھو کر پیا کریں گی۔ ایسا بھی کیا اندھیر ہے کہ بیاہ ہونے کے ساتھ آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لیں گی۔ حسن آرا کو صبیحی محبت محمودہ کے ساتھ ہے آپ تو

دیکھتی ہیں۔ رہیں جمال آرا، سو دل کی خدا جانے، ظاہر میں جب ملتی ہیں، بچھی جاتی ہیں۔ میں بھی تو آخر جیتی بیٹھی ہوں۔ محمودہ کو بُری طرح رکھیں گی تو مجھ کو کیا مُنھ دکھائیں گی۔ اور تو بات کی ایک بات تو میں یہ جانتی ہوں کہ ساس نندیں بھی ہوا کو دیکھا کرتی ہیں۔ لڑکے کو ریجھا ہوا دیکھیں گی تو کسی کی مجال نہیں محمودہ کو آنکھ بھر کر دیکھ لے۔

محمد کامل کی ماں نے کہا۔ آخر تمھاری مرضی کیا ہے؟ شربت کے پیالے پر نکاح پڑھا دوں؟

اصغری نے کہا۔ یہ تو میرا مطلب نہیں اور نہوت میں شربت بھی نہیں جُڑتا تو کیا بیٹا بیٹی کے کام کاج نہیں کرتے؟ دینا دِلانا بھی ایک دنیا جہاں کی رسم ہے۔ جتنی چادر دیکھے اتنے پاؤں پھیلائے۔ مقدور موافق جو بن پڑا دیا۔ نہ بن پڑا نہ دیا۔ نام نمود کے پیچھے گھر کا دیوالہ نکال بیٹھنا بھی عقل کی بات نہیں۔ میرے مکتب میں سلمیٰ لڑکی پڑھتی ہے اُس کے ابا کو غدر کے پیچھے سرکار سے دس ہزار روپیہ انعام کا ملا تھا۔ کسی میم کی جان بچائی تھی۔ دس ہزار روپیہ اُن کو اتنا تھا کہ عمر بھر آرام سے رہتے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی بیاہنے کو اٹھے۔ شیخی میں آکر دس ہزار سرکار کا دیا ہوا اٹھا بیٹھے۔ اور ہزار پانسو اوپر سے قرض لیکر لگا دیا۔ اُس وقت تو خوب ہر طرف سے واہ واہ ہوئی اب گھر میں اس قدر تنگی ہے کہ کھانے تک کو حیران ہیں۔ بیاہ میں مجھ کو بھی بلوا آیا تھا۔ سامان دیکھ کر میرے تو ہوش اڑ گئے بلکہ شاید سلمیٰ کی

اماں نے جی میں بُرا مانا ہو۔ میں نے تو کہہ دیا تھا کہ بوا بیٹا بیٹی کا دینا آنکھوں سکھ کلیجے ٹھنڈک، گھی کہاں گیا کھچڑی میں۔ مگر اپنی ہنڈیا کی خیر منانی بھی ضرور ہے۔ کہنے کو تو میں اتنا کہہ گزری مگر پیچھے مجھ کو پچھتاوا بھی آیا کہ سلمیٰ کی بہن سمجھی ہوگی کہ استانی جی لینا ایک نہ دینا دو۔ ناحق بھانجی مارتی ہیں۔

محمد کامل کی ماں نے کہا۔ ہاں سچ ہے مگر کمبخت دنیا میں رہنا ہے، کیا کریں، کہاں جائیں، ہو یا نہ ہو۔ کرنا ہی پڑتا ہے۔ دُنیا کی سی نہ کریں تو نکو کون بنے، انگشت نما کون ہو؟ میں نے مولوی اسحٰق صاحب کے درس میں سُنا تھا کہ اگلے وقتوں میں عرب لوگ بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے۔

اصغری نے کہا۔ اماں جان دور کیوں جاؤ ہمارے مُلک میں راجپوت بھی تو یہی غضب کرتے تھے۔ اب انگریزوں کی روک ٹوک سے بندی ہوئی ہے۔ اس پر بھی کئی دفعہ بھنک سُن پڑی ہے کہ چوری چھپے خون ہوئے۔

محمد کامل کی ماں نے کہا۔ عقل کیا کرے غیرت قبول نہیں کرتی۔

اصغری بولی غریبی میں غیرت کی کیا بات ہے؟ دنیا میں غریب لوگ زیادہ ہیں۔ اگر غریب ہونا غیرت کی بات ہے تو دُنیا میں بے غیرت بہت ہیں، امیری غریبی سب اپنی اپنی قسمت ہے۔ سب یکساں کیونکر ہو جائیں؟

محمد کامل کی ماں بولی۔ اے ہے، بلائے شادی بیاہ میں بہت خرچ کرنے کی تو کچھ انگریزی سرکار سے منا ہی ہو جاتی تو جھگڑا مٹتا۔

اصغری:۔ اخباروں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انگریز لوگ کچھ بندوبست کرنے والے

ہیں۔ ہمارے شہر کے رئیس بھی تو سب بلائے گئے تھے اور سُنا ہے کہ خرچ کی ایک حد باندھی گئی ہے۔ مرکا اندازہ مقرر ہوا ہے مگر یہ کام ہم لوگوں کے کرنے کے ہیں۔ سب ایکا کر کے جتنے خرچ فضول ہیں موقوف کریں۔

محمد کامل کی ماں:۔ خرچ کے فضول ہونے کی جو تم نے کہی تو جس کو خدا نے دیا ہے کچھ فضول نہیں ہاں جس کے پلّے کوڑی نہیں اُس کو تو سب ہی فضول ہے۔

اصغری:۔ یہ نہ فرمائیے۔ شادی بیاہ میں تو واجبی خرچ کم ہے فضول باتوں میں بہت روپیہ اُٹھ جاتا ہے۔ ہمارے خاندان میں تو ناچ تماشا۔ باجا گاجا۔ آتشبازی۔ نوبت۔ نقارہ کچھ ہوتا ہوا نہیں مگر جن کے یہاں ہوتا ہے اسی میں سیکڑوں ہزاروں پر پانی پھر جاتا ہے۔

محمد کامل کی ماں:۔ ناچ تماشا جن کے یہاں ہوتا ہو، وہ جانیں۔ بھلا ہمارے یہاں کون خرچ فضول ہے؟

اصغری:۔ کیوں نہیں؟ منگنی، تیج تہوار۔ سانچق۔ مہندی۔ برات، بھوڑا۔ چوتھی۔ چالے۔ بہت بھاری بھاری جوڑے۔ جڑاؤ گہنا سب ہی فضول ہیں۔

محمد کامل کی ماں:۔ کیوں نہیں کہتیں کہ سرے سے بیاہ ہی فضول ہے۔

اصغری ہنسنے لگی اور کہا کہ بیاہ تو فضول نہیں۔ مگر اُس کے لازمے

البتہ ناحق کے ڈھکوسلے ہیں۔

محمد کامل کی ماں :۔ بھلا رئیس تو رہیں تم تو کپڑوں اور زیور کو بھی فضول بتاتی ہو۔

اصغری :۔ نوسے کپڑے اور نرا زیور تو کام کی چیز ہے مگر بھاری بھاری جوڑے آپ ہی انصاف فرمائیے کہ کس کام آتے ہیں؟ خود میرے جوڑے پڑے گلتے ہیں۔ گھر میں پہننے سے کمبخت دل کڑھتا ہے۔ کبھی کبھار شادی بیاہ میں پہن لئے یا عید بقرعید کو ذرا کی ذرا نکلے باقی بارہ مہینے گٹھڑی میں بندھے رکھے ہیں۔ آئے دن دھوپ دینا مفت کا دردسر اور جو بیچنے اٹھو تو مال کا مول نہیں ملتا۔ مصالح کے دام تک بھی نہیں کھرے ہوتے۔ اور یہی حال جڑاؤ زیور کا ہے۔ مولوی کفایت اللہ کی بیٹی کا بیاہ آپ نے سنا ہے پس ایسے بیاہ مجھ کو پسند ہیں۔

محمد کامل کی ماں :۔ کون مولوی کفایت اللہ؟

اصغری :۔ لڑکیوں کے مدرسوں کے افسر۔

محمد کامل کی ماں :۔ وہ تو شاید شہر کے رہنے والے نہیں ہیں؟

اصغری :۔ نہیں۔ آگرہ کی طرف کے رہنے والے ہیں۔ بیوی بچوں کو اپنے پاس بلا لیا ہے۔ بیٹی کی منگنی اسی شہر میں کی تھی۔ بیوی کی مرضی یہ تھی کہ اپنے شہر میں جا کر بیٹی کا بیاہ کریں۔ یہاں سے برات جائے۔ مولوی صاحب نے بیوی کو سمجھا بجھا کر راضی کر لیا۔ ایک دن دو چار

میل ملاپ والوں کو بلا بھیجا۔ مہمان جو گھر میں پہنچے تو سنا کہ بیٹی کا نکاح ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد سمدھی لڑکے کو ساتھ لے آموجود ہوئے۔ شرع محمدی پر نکاح پڑھا دیا۔ اللہ اللہ خیر صلاح۔ دان دہیز جم ہی جم دیا۔ نکاح کے بعد پانسو روپئے نقد مولوی صاحب نے بیٹی داماد کے آگے لا کر رکھ دیئے اور کہا کہ بس بھائی میری کمائی میں تمہاری تقدیر کا اسی قدر تھا اگر میں چاہتا تو اس میں مہمانداری بھی کر دیتا اور دنیا کے دستور کے موافق ایک دو بھاری جوڑے بھی بنا لیتا مگر میں نے سوچا تو یہی مناسب معلوم ہوا کہ نقد روپے تم کو دنیا بہتر ہے اب تم جس طرح چاہو اس کو کام میں لاؤ۔

محمد کامل کی ماں سن کر بولیں کہ ہاں پردیس میں مولوی صاحب جو چاہتے سو کرتے۔ کہنے سننے والا کون تھا؟۔

اصغری :۔ کیوں کہنے سننے والی گھر والی بیوی اور پردیس پر کیا موقوف ہے۔ ہمت چاہیئے، کرنے والا ہو تو شہر میں بھی کر گزرے۔ کہنے والوں کو بکنے دیا اپنے کام سے کام۔

محمد کامل کی ماں :۔ کیا تم نے محمودہ کا اسی طرح کا ادگھتا اداس نکاح تجویز کیا ہے؟۔

اصغری :۔ بیشک، میں تو لوگوں کے کہنے سننے کی کچھ پروا نہیں کرتی میرا بس چلے تو محمودہ کا نکاح مولوی کفایت اللہ کی بیٹی کا جواب ہو۔ انھوں نے دو چار مہمان بھی بلائے تھے اور میرے نزدیک اس کی بھی ضرورت نہیں

محمد کامل کی ماں:۔ نہ بوا، خدا کے لیے ایسا غضب تو مت کرو۔ اس بڑھوتی میں میری تو یہی بچّی بیاہنے کو ہے۔ اب کیا میں قرے کسی کا بیاہ برات کرنے پھر آؤں گی؟

اصغری:۔ نہیں، ایسا تو میرا بھی ارادہ نہیں ہے مگر البتہ یہ بات ضرور میں نے اپنے دل میں ٹھان رکھی ہے کہ نہ تو ایک پیسہ قرض کا لیا جائے اور نہ کوئی جائداد گروی رکھی جائے۔ جو کچھ جوڑا بٹورا اُس کے نام کا رکھا ہے اور جو کچھ اُس کی تقدیر سے عین وقت پر ہو جائے بس کافی ہے۔

محمد کامل کی ماں:۔ سبحان اللہ! ایسا ہو تو کیا بات ہے! مگر جب دوسری طرف والے بھی ہامی بھریں۔

اصغری:۔ اور اگر وہ راضی ہو جائیں؟

محمد کامل کی ماں:۔ اُن کا راضی ہونا کیا ہنسی ٹھٹھا ہے؟ اللہ آمین کا ایک تو بیٹا۔ نہیں معلوم کیا کیا حوصلے اُن کے دلوں میں ہیں۔ وہ تو برابر کی ٹکر کا گھر دیکھ کر بات کریں گے اور سب ارمان نکالیں گے۔

اصغری:۔ جب سے میں سیالکوٹ سے آئی ہوں اس بات کی تدبیر کر رہی ہوں، اُدھر سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا ہے۔ ابھی جمال آرا اور حُسن آرا بھاگی ہوئی آئی تھیں۔ چھوٹے حکیم صاحب کو بھی منظور ہے۔ شاہ زمانی بیگم نے اپنی بیٹی کے واسطے بہت بہت تدبیریں کیں۔ خدا کے فضل سے کوئی کارگر نہ ہوئی اب دیر نہیں کرنی چاہئیے۔ پرسوں دن بھی اچھا ہے، اُدھر سے مٹھائی آ جائے

بات پکّی ہو جائے پھر بیاہ کو دیکھا جائے گا۔

محمد کامل کی ماں یہ سُن کر حیران رہ گئیں اور کہا کہ بات تو بہت اچھی ہے ہماری لیاقت سے کہیں زیادہ ہے لیکن اُن کے لائق سامان ہم سے ہونا مشکل ہے۔

اصغری نے کہا۔ خدا مسبب الاسباب ہے۔ جب محمودہ کی تقدیر ایسے اونچے گھر میں لڑی ہے تو خدا اپنی قدرت سے وقت پر کچھ سامان بھی کر دے گا۔

محمد کامل کی ماں نے کہا۔ اپنے سُسرے کو آنے دو مٹھائی کے واسطے اُن سے پوچھ دوں۔

تھوڑی دیر میں مولوی صاحب آئے اور منگنی کا حال سُن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ بے تامل پرسوں مٹھائی آئے۔

اصغری نے حُسن آرا کو کہلا بھیجا۔

روز مقررہ پر پانچ من مٹھائی اور سَو روپے آ گئے۔ سوا من مٹھائی اور سَوا سو روپیہ یہاں سے گیا ہر طرف سے مبارک سلامت ہو گئی۔

CH. 29

منگنی کا ہونا تھا کہ چھوٹے حکیم صاحب نے بیاہ کا تقاضا کرنا شروع کیا اور مولوی صاحب سے کہلا بھیجا کہ مدت سے میرا ارادہ حج کو جانے کا ہے اور صرف اسی بات کا انتظار ہے۔ زندگی کا اعتماد نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ رجب کے مہینے میں عقد ہو جائے۔

مولوی صاحب نے اصغری سے پوچھا۔

اصغری نے کہا بالفعل یہ کہلا بھیجنا چاہئیے کہ ہم فکر میں ہیں۔ جہاں تک

ہوسکتا ہے جلد تدبیر کرتے ہیں۔ سامان مختصر جو دینا منظور ہے اگر اس عرصے میں جمع ہوجاتا ہے تو ہم کو بھی یہ فرض آخر ادا کرنا ہے جس قدر جلد ہو بہتر۔

حکیم صاحب نے پھر کہلا بھیجا کہ میں نے جہیز اور سامان کی اُمید سے آپ کے یہاں رشتہ نہیں کیا۔ مجھ کو لڑکی چاہیئے۔ آپ سامان کی فکر کچھ نہ کیجئے۔

ادھر سے جواب دیا گیا کہ بہت خوب ہم کو بھی رجب میں عقد کر دینا منظور ہے، ستائیس تاریخ رجب کی مقرر ہوئی اور دونوں طرف سامان ہونے لگے، سامان کا شروع ہونا تھا کہ مولوی صاحب کو فکر پیدا ہوئی۔ کبھی کہتے تھے کہ ہزاری مل سے قرض لوں۔ کبھی سوچتے تھے گھی کا کنستر بیچ ڈالوں یا گروی رکھ دوں۔

اصغری نے مولوی صاحب کو پریشان دیکھ کر پوچھا کہ آپ نے کیا تدبیر کی ہے؟

مولوی صاحب نے کہا۔ کیا بتاؤں شادی کی تاریخ سر پر چلی آتی ہے اور روپیہ کی صورت کہیں سے بن نہیں پڑتی۔ ہزاری مل سے میں نے روپیہ مانگا تھا وہ ٹکل کیا۔ گھی کے کنستر کو جُدا کر دینے کا ارادہ تھا۔ کوئی خریدار نہیں کھڑا ہوتا۔

اصغری نے کہا۔ ہرگز ہرگز آپ قرض نہ لیجئے اور نہ جائداد کو فروخت کیجئے قرض سے بدتر کوئی چیز نہیں ہے اور جائداد کا جُدا ہونا کیا مشکل ہے لیکن اس کا بہم پہنچنا بہت دشوار ہوتا ہے۔

مولوی صاحب نے کہا۔ قرض تو لوں نہیں اور جائداد جُدا نہ کروں تو کیا میں کیمیاگر ہوں یا دستِ غیب جانتا ہوں روپیہ کہاں سے آئے؟

اصغری نے کہا پہلے گھر کا حساب دیکھ لیجئے۔ کپڑے تو کچھ پہلے سے تیار ہیں۔ صرف تھوڑا مصالح درکار ہوگا۔ سو میرے جوڑوں میں بعضے بہت بھاری ہیں اُن میں سے کم کرکے اتنا مصالح نکل آئے گا کہ محمودہ کے جوڑوں کو کافی ہوجائے گا۔ برتن موجود ہیں۔ کوئی مول لینا نہیں۔ کاٹ کباڑ سامان بالائی یہ سب میں اپنا دیدوں گی۔ بیفائدہ پڑا پڑا خراب ہوتا ہے۔ نہ میرے کسی مصرف کا ہے اور آخر آپ کے پاس بھی کچھ روپیہ نقد ہوگا۔

مولوی صاحب نے کہا صرف پانسو ۵۰۰ روپیہ ہے

اصغری نے کہا۔ بس بہت ہے جب میں سیالکوٹ جانے لگی مکتب کی رقم کے چار سو ۴۰۰ روپیہ تھے وہ امانت رکھے ہیں۔ میرے پیچھے دو سو ۲۰۰ روپیہ اور ہوا۔ سوا دھا آپا کا حق ہے اور سو ۱۰۰ روپیہ محمودہ کا، یہ ملا کر مکتب کی رقم کے پانسو ۵۰۰ ہوجائیں گے۔ محمودہ کے چھوٹے بھائی کو میں نے خط لکھا ہے اور تین سو ۳۰۰ روپیہ منگوایا ہے۔ دو سو ۲۰۰ روپیہ بھائی جان نے بھیجنے کو لکھا ہے اس طور پر ڈیڑھ ہزار روپیہ نقد اس وقت موجود ہے۔ ہزار کے کڑے جو حسن آرا کے بیاہ میں مجھ کو ملے تھے میرے کس کام کے ہیں۔ میرا ارادہ تھا کہ محمودہ کو چڑھا دوں لیکن پھر غور کیا تو اُسی گھر کے کڑے اُسی گھر میں جانے مناسب نہیں معلوم ہوتے ہیں اُن کو بیچ ڈالوں گی۔ تماشا خانم کی معرفت بازار میں بھیجے تھے۔ چنا مل تیرہ سو ۱۳۰۰ روپے دیتا تھا۔ محمودہ کی تقدیر سے اگر کوئی حاجت مند مل گیا انشاء اللہ پندرہ ۱۵۰۰ سو وصول ہوجائیں گے اور ایک تدبیر

یہ ذہن میں آتی ہے کہ آپ بھائی جان کے لانے کو لاہور جائیے اور رئیس پر رخصت کی تقریب میں یہ بات ظاہر کر دیجئے۔ رئیس بڑا سیر چشم ہے اُمید ہے کہ ضرور کچھ مدد کرے گا۔ ہمیشہ سے ہندوستانی سرکاروں کا دستور رہا ہے ایسی تقریبات میں اپنے معتمد نوکروں کی اعانت کی ہے۔

غرض اصغری نے سسرے کو لاہور بھیجا۔ مولوی صاحب رئیس کے سلام کو جو گئے تو رئیس نے پوچھا مولوی صاحب کیونکر تشریف لائے۔

مولوی صاحب نے عرض کیا کہ بندہ زادی کا عقد ہے اس غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ محمد عاقل کو ایک مہینے کی رخصت مرحمت ہو اور یہ تو عرض نہیں کر سکتا کہ حضور کے خاندان سے کوئی شریک ہو لیکن اگر دیوان صاحب جو دہلی میں ہیں سرکار کی طرف سے زیب دہ محفل ہوں تو ہمچشموں میں میرے لئے افزائش ابرو کا باعث ہوگا۔

رئیس نے محمد عاقل کی رخصت بھی منظور کی اور مولوی صاحب کو آنے جانے کا خرچ دیا اور دیوان صاحب کو حکم بھیجدیا کہ ہماری طرف سے مولوی صاحب کی محفل میں شریک ہونا اور پانسو روپیہ نیوتے کا دینا۔

اصغری کی صلاح سے بیٹھے بٹھائے یہ پانسو روپیہ مفت کا آگیا۔ اُدھر جڑاؤ کڑے تماشا خانم کی معرفت نواب حاتم زمانی بیگم تک پہنچے۔ دیکھ کر لوٹ ہو گئیں اور آنکھ بند کر کے دو توڑے حوالے کر دیے۔ اب تو روپیہ کی ہر طرف سے ریل پیل ہو گئی۔

اصغری کا اہتمام عمدہ سے عمدہ جوڑے تیار ہوئے اور چوہرا زیور بنا وہ شادی ہوئی کہ مولوی صاحب کی کئی پشتوں میں نہ ہوئی تھی اور سمدھیانے والے بھی سامان دیکھ کر دنگ ہو گئے جو سامان تھا متعدد اور بیش قیمت اور جو چیز تھی نئے طور کی تھی۔ دو جوڑے تو بیٹے دانوں کی طرف سے آئے ایک رِیت کے واسطے، کرکری تاش کا۔ دوسرا چوتھی کے واسطے کارچوبی اور گنے جہیز اور چڑھاوے کے ملا کر تو بے انتہا تھے۔ ناک میں نتھ اور کیل۔ ماتھے کو ٹیکا، جھومر، بینا، کانوں میں بالی پتے جڑاؤ اور سادے، چھپکے کے بالے، کان میں جھالے، مگر، مُرکیاں، بجلیاں، کرن پھول، جھمکے۔ گلے میں گلوبند طوق، چمپاکلی، کنٹھی، توڑا، دُھگدگی، چندن ہار، زنجیر، مالا۔ بازو پر چوشن، نورتن، بھج بند، نونگے، ہاتھوں میں کڑے، نوگرھی، چوہے دنتیاں چوڑیاں، دست بند، انگلیوں میں انگوٹھی، چھلے، جوڑ۔ پانوں میں پازیب، توڑے، چھلے، چٹکی، چھلے۔ کارچوبی جالدار مصالحہ دار سب ملا کر پچاس جوڑے، دو سو برتن اور اسی حیثیت کا بالائی سامان۔ غرض بڑی دھوم دھام سے عقد ہو گیا۔

محمودہ رخصت ہوئیں، قمر آستانی بیگم سُسرال سے خطاب ملا۔

حکیم فتح اللہ خاں بڑے متقی پرہیزگار باخدا آدمی تھے، مدتوں سے حج کا ارادہ کر رہے تھے لیکن صرف ارجمند خاں کے بیاہ کے منتظر تھے اب بیاہ ہونے کے بعد چند روز تک ہو کا رنگ ڈھنگ دیکھتے رہے۔ یہاں دیکھنے کی کیا حاجت تھی محمودہ تو بی اصغری صاحبہ کی خراد پر چڑھ چکی تھی کسی طرح

CH. 30

کی کورکسر اس میں باقی نہ تھی۔ حکیم صاحب نے جس قدر آزمایا۔ بہو کو ہنرمند عاقلا، سلیقہ شعار پایا۔ کچھ تو خرچہ بیٹھا اور کچھ اوپر سے ملا قند، اوّل تو خود محمودہ اپنی ذات سے اچھی اور اس پر اصغری کی تعلیم، اصغری کی صلاح پھر کیا پوچھنا تھا۔ غرض حکیم صاحب کو خوب یقین ہوگیا کہ قمر آستانی بیگم اچھی طرح گھر کو سنبھال لیں گی۔

اب حکیم صاحب نے یکایک زور شور کے ساتھ عرب کی تیاریاں کرنی شروع کیں، یا تو حج کی نیت تھی یا ہجرت کا ارادہ کر لیا نقد کی قسم سے جو کچھ تھا اپنے ساتھ لیا۔ مکانات دُکانیں۔ کٹرے۔ گنج۔ دیہات۔ سرائیں سب کچھ بیٹے کے نام لکھ دیا۔ رشتے ناتے کے لوگوں نے جیسا دستور ہے سمجھایا بھی لیکن حکیم صاحب کو تو خُدا کی دُھن تھی ایک نہ سُنی۔ خدا کا نام لے، چل کھڑے ہوئے اور دُنیا بھر کی جائداد بیٹے بہو کو دے گئے۔

محمودہ اگرچہ بیاہی جا چکی تھی لیکن پھر بھی اصغری کا ادب لحاظ پہلے سے زیادہ کرتی تھی۔ ذرا ذرا بات میں اصغری سے صلاح لیتی۔ اب البتہ اصغری کو اپنی عقل آزمانے کا موقع ملا، بڑا کارخانہ بڑے کام، وہ دہ انتظام کئے کہ ارجمند خاں کو خدا جھوٹ نہ بلوائے، دولت کا بادشاہ وزیر بنا دیا۔ کوئی سرکار اس کے مقابلے کی دہلی کیا۔ دُور دُور نہ تھی، کہاں تک یہ داستان لکھی جائے اتنا لکھا جا چکا لیکن اگر سچ پوچھو تو ابھی من میں چٹانک بھی نہیں ہوا۔ ابھی تک تو اصغری مفلسی میں تھی۔ اب خدا کے ثروت نصیب ہوئی انتظام کا

قابو بندوبست کا موقع من مانتا ملا اس حالت میں جو جو کام اس عورت نے کئے وہ البتہ قیامت تک زمانے میں یادگار رہیں گے۔ مگر افسوس ہے کہ اُن کے لکھنے کی فرصت نہیں پھر بھی اگر نصیحت ماننے والا ہو اور بات کا سُننے والا اور سمجھنے والا تو جس قدر لکھا جا چکا کم نہیں۔ ہر طرح کی بات ہر قسم کی تعلیم اس میں موجود ہے۔ کہنے کو قصّہ اور حکایت ہے لیکن حقیقت میں نصیحت اور ہدایت۔

اب اس کتاب کو ختم کرنے سے پہلے ایک بات اور لکھنی ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ:۔

اصغری بہت چھوٹے سے سن میں ماں بن گئی تھی۔ ابھی تک کچھ اُس کی اولاد کا تذکرہ نہیں ہوا۔ اصغری کے بچّے تو بہت ہوئے لیکن خدا کی قدرت زندہ کم رہے۔ صرف ایک لڑکا محمد اکمل جو اخیر میں محمودہ کی اکلوتی بیٹی مسعودہ سے بیاہا گیا زندہ رہا۔ یہ لڑکا کئی بچّوں کے اوپر پیدا ہوا۔ اس سے پہلے محمد عادل ایک بیٹا اور بتول ایک لڑکی مر چکی تھی۔ بچّوں کی پرورش میں احتیاط تو بہتیری ہوتی تھی۔ سردی، گرمی کا بچاؤ۔ کھانے تک کا وقت مقرر اور بندھا ہوا۔ اندازہ اور خبرداری یہ کہ ثقیل اور ردّی چیزیں منھ میں نہ ڈال لے دانت نکلنے شروع ہوئے اور مسوڑوں میں نشتر دیا گیا کہ ایسا نہ ہو دانتوں کی تکلیف کو بچہ سہار نہ سکے۔ چار برس کے ہوئے اور چیچک کے بچاؤ کی نظر سے ٹیکا لگوا دیا گیا۔ غرض جہاں تک آدمی کی عقل کام کرتی ہے سب طور کا

بند و بست کیا جاتا تھا لیکن تقدیر کے آگے کسی کی حکمت نہیں چلتی۔

محمد عادل چار برس کا ہو کر مرا۔ پیچش ہوئی دست بند کرنے کی دوا دی بخار آنے لگا۔ سرسام ہو گیا۔ پلا پلایا لڑکا ہاتھ سے جاتا رہا۔ ابھی اس کا داغ تازہ تھا کہ تبول سات برس کی ہو کر بیمار پڑی کچھ ایسے بلا کے دست چھوٹے کہ جان لیکر بند ہوئے۔ دنیا جہان کی دوائیں ہوئیں موت کب دوا کو مانتی ہے ایک ہی ہفتے میں لڑکی تحلیل ہو کر چلی گئی۔ تبول کے مرنے کا اصغری پر بہت بڑا صدمہ ہوا۔ اول تو لڑکی دوسرے کچھ مرنے والی تھی یا کیا؟ ایسی ماں پر فریفتہ تھی کہ ایک دم کو الگ نہ ہوتی تھی۔ ماں نماز پڑھتی ہے تو جانے نماز پر بیٹھی ہے۔ ساتھ سونا، ساتھ اٹھنا، ماں کی دوا تک ہو، چکھ لینا ضرور، اور اس چھوٹی سی عمر میں بس پڑھنے میں دھیان۔ دسویں سیپارے کا ترجمہ شروع تھا جب محمد عادل مرا تھا۔ عورتوں نے اصغری کے ایمان میں خلل ڈالنا شروع کیا تھا۔ کوئی کہتی کوکھ کا خلل ہے مہر علی شاہ کا علاج کرو۔ کوئی کہتی دودھ پر نظر ہے چوراہے میں اُتارا رکھواؤ۔ کوئی کہتی مسان کا دُکھ ہے رمضان شاہ سے گنڈا نت کراؤ۔ کوئی کہتی مکان اچھا نہیں میر علیم سے کیلواؤ۔ کوئی کہتی سفر میں آئی گئی ہو کوئی چڑیل لپٹ گئی ہے، کچھ پیچھے چلو، گنڈے اور تعویذ اور عمل ٹونے اور ٹوٹکے تو دنیا جہان کے لوگ بتاتے تھے لیکن واہ ری! اصغری، یوں اوپر تلے دو بچے مرے لیکن سدا خدا پر شاکر رہی۔

کسی نے کچھ کہا بھی تو یہی جواب دیا، خدا کو جب منظور ہو گا تو یوں بھی وہ

نفضل کر سکتا ہے۔

CH. 31

تبول کے مرنے کی خبر جب دوراندیش خاں صاحب کو ہوئی تو بہت مضطرب ہوئے اور اس اضطراب میں بیٹی کے نام یہ خط لکھا۔

دُوراندیش خاں کا خط

برخوردار اصغری خانم کو بعد دُعا کے معلوم ہو،

اس وقت ڈاک کے خط سے مجھ کو تبول کے انتقال کا حال معلوم ہوا میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ مجھ کو رنج نہیں ہوا مگر میری عقل اس قدر بیجا نہیں ہوئی کہ نادان آدمیوں کی طرح میں بے صبری کروں۔ مجھ کو بڑا تردد تمھارا ہے۔ عجب نہیں کہ تم پر یہ صدمہ بہت شاق ہوا ہو لیکن ہر ایک حالت میں انسان کو عقل سے مشورہ لینا چاہیئے۔ عقل ہم کو اسی واسطے بخشی گئی ہے کہ رنج ہو یا خوشی ہم اپنی عقل سے اُس میں مدد لیں۔

دُنیا کے حال پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔ اور یہ غور فائدے سے خالی نہیں۔ زمین، آسمان، پہاڑ جنگل، دریا، انسان، حیوان، درخت لاکھوں طرح کی چیزیں دُنیا میں ہیں اور دُنیا کا ایک بہت بڑا بھاری کارخانہ ہے دن میں ایک معمول کے ساتھ آفتاب کا نکلنا پھر رات کا ہونا اور چاند اور ستاروں کا چمکنا، کبھی گرمی، کبھی سردی، کبھی برسات اور پانی کے اثر سے انواع اور اقسام کے رنگ برنگ پھل اور پھولوں کا پیدا ہونا، ہر ایک بات پر غور کرنے والے کو برسوں کے سوچنے کو کافی ہے۔

خود آدمی کو اپنا حال غور کرنے کو کیا کم ہے؟ کیونکہ آدمی پیدا ہوتا اور کیونکر پرورش پاتا اور بڑا ہوتا اور کیونکر لڑکپن اور جوانی اور بڑھاپے کی حالتیں اُس پر گزرتی ہیں اور کیونکر آخر میں دُنیا سے سفر کر جاتا ہے؟۔

یہ بڑا عمدہ اور مشکل مضمون ہے۔ یہ سب کارخانہ کسی مصلحت سے خدا نے جاری کر رکھا ہے اور جب تک وہ چاہے گا اسی طرح یہ کارخانہ جاری رہے گا۔

دُنیا صرف سات یا آٹھ ہزار برس سے ہے اور اس کی عمر بہت تھوڑی ہے یعنی اب قیامت بہت قریب ہے اور جلد تر دُنیا کو فنا ہونا ہے۔ دُنیا کی خانہ شماری سے ثابت ہوا ہے کہ ایک گھنٹے میں ساڑھے تین ہزار آدمی کے قریب دُنیا میں مرتے ہیں یعنی ہر ایک پل میں ایک آدمی اور اسی قدر پیدا بھی ہوتے ہوں گے۔ اب حساب کر لو کہ صرف ایک مہینے میں کے لاکھ آدمی دُنیا میں مرتے اور پیدا ہوتے ہیں اور پھر غور کرو کہ سات ہزار برس سے یہی تار چلا آتا ہے یعنی بیشمار آدمی اب تک دُنیا میں مر چکے ہیں۔ بس موت ایک ضروری اور معمولی بات ہے۔

بڑے بڑے زبردست بادشاہ، بڑے بڑے عالم، بڑے بڑے حکیم، یہاں تک کہ بڑے بڑے پیغمبر جو مُردوں کو جلا سکتے تھے خود موت سے نہ بچ سکے "دنیا میں جو پیدا ہوا ہے یہ خدا کا ضروری حکم ہے کہ وہ ایک دن مرے"۔

پس اگر یہ حکم کسی دن ہم پر یا ہمارے کسی عزیز قریب پر جاری کیا جائے

تو کوئی وجہ شکایت اور فریاد کی نہیں۔

یہ مضمون سرسری نہیں ہے اس کو خوب غور کرو اور جب تم کو موت کی حقیقت معلوم ہو جائے گی تو یقین ہے تم میری طرح سمجھ لوگی کہ کسی کے مرنے پر رنج کرنا لاحاصل اور بے سود ہے کسی کی موت پر رنج کرنا تعلق پر موقوف ہے۔ اگر ہم سُنیں کہ مُلک چین کا بادشاہ مر گیا۔ ہم پر اس خبر کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ اس واسطے کہ ہم کو اس سے کچھ تعلق نہ تھا۔ بلکہ محلے میں اگر کوئی غیر آدمی مر جائے۔ جس سے کسی طرح کا واسطہ نہیں تو ہم کو بہت کم رنج ہوگا۔

پس ہم کو رنج اُسی شخص کے مرنے کا ہوتا ہے جس سے ہم کو تعلق ہے اور جتنا تعلق قوی ہے اُسی قدر رنج زیادہ۔

نانی کی بھتیجی کی خالہ کی بہو کی پھوپھی کی بھانجی اگر مرے تو کیا، دُور کا واسطہ دُور کا رشتہ ناتے پر کیا موقوف ہے؟ محبت ملاپ میں بھی رنج ہوتا ہے۔

اب سوچنا چاہیئے کہ دُنیا میں ہم کو تعلق کس سے زیادہ ہوتا ہے؟ اس کے واسطے کوئی قاعدہ مقرر نہیں۔ قریب کا رشتہ ہو اور سدا کی لڑائیاں سدا کے بگاڑ رہے تو ایسے رشتہ دار غیر میں داخل۔ لیکن غیر ہے رشتہ نہیں، قرابت نہیں۔ محبت ملاپ بہت کچھ وہ رشتہ داروں سے بڑھ کر ہے۔

پس ہر ایک شخص موافق اپنی حالت کے خاص تعلق رکھتا ہے، یہ دُنیوی تعلقات سب فائدے اور غرض سے ہوتے ہیں اگر اپنا سگا ہمارے فائدہ میں خلل انداز ہو ضرور ہے کہ وہ ہم سے چھوٹ جائے اگر غیر آدمی ہمارے

کام آوے ضرور ہے کہ وہ ہم کو مثل اپنوں کے عزیز ہو لیکن وہ فائدہ جس سے تعلق پیدا ہوتا ہے ضرور نہیں کہ روپے پیسے کا ہو۔ اگرچہ اکثر اسی قسم کا ہوتا ہے۔

کبھی اُمید اور توقع سے بھی تعلق پیدا ہوتا ہے۔ بہت لوگ ہمارے دوست ہیں جو ہم کو کچھ دے نہیں دیتے لیکن یہ توقع کہ اگر کبھی ہم کو کسی طرح کی ضرورت ہو تو کام آنے والے ہیں تعلق کے پیدا ہونے کی وجہ ہوتی ہے۔

میں اس بحث کو بہت طول دے سکتا ہوں اور جس قدر اس بحث کو طول دیا جائے مناسب ہے لیکن اصل مطلب میرا اس خط میں صرف اولاد کے تعلق سے بحث کرنا ہے اور اگر فرصت ملے گی تو انشاء اللہ اس تعلق پر ایک کتاب لکھ کر تم کو بھیجدوں گا۔

یہ تعلق جو اولاد سے ہے عام ہے کوئی ماں باپ بلکہ کوئی جانور تک اس سے خالی نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف فائدہ اور غرض پر اس کی بنا نہیں بلکہ خداوند عالم جو بڑا دانشمند ہے اُس کا انتظام چاہتا ہے کہ ضرور ماں باپ کو اپنی اولاد کی محبت ہو۔

اولاد چند سال تک محتاج پرورش ہوتی ہے تاکہ اولاد کی پرورش اچھی طرح ہو، ماں باپ کو اولاد کی محبت لگا دی کہ اس محبت کے لگاؤ سے بچوں کو پالیں اور بڑا کریں یہانتک کہ بڑے ہو کر خود دُنیا میں رہنے سہنے لگیں۔ پس ماں باپ پرورش اولاد کے واسطے اُن کے خدمت گزار ہیں

پس اولاد کا پال دینا صرف اتنا تعلق تو خدا کی طرف سے ماں باپ کو دیا گیا باقی یہ بکھیڑے کہ اب اولاد کی تمنا ہے، نہیں ہے تو دوا اور علاج ہے اور تعویذ گنڈا ہے۔ عمل ہے اور دُعا ہے۔ یا اولاد ہوئی تو یہ فکر ہے کہ بیٹے ہوں بیٹیاں نہ ہوں یا جو ہوں زندہ رہیں۔ یہ خود انسان کی اپنی ہوس کے تقاضے ہیں۔

رہی یہ بات کہ اولاد کی تمنا جو آدمی نے خدا کی مرضی سے زیادہ اپنے دل میں پیدا کی۔ کس وجہ سے ہوتی ہے۔ بیشک فائدے اور غرض کیواسطے ہوتی ہے لیکن فائدے کئی قسم کے ہیں۔

بعض یہ سمجھتے ہیں کہ اولاد سے نام چلتا ہے۔

بعض کو یہ خیال ہوتا ہے کہ بڑھاپے میں ہمارے مددگار ہوں گے۔

بعض کو یہ تصور ہوتا ہے کہ ہمارا مال و دولت ہمارے بعد لیں گے۔

اب ان خیالات پر غور کرو۔ کس قدر بیہودہ اور غلط ہیں۔ نام چلنا کیا معنی؟ کہ لوگ جانیں کہ یہ فلانے کے بیٹے، فلانے کے پوتے ہیں۔

اوّل تو جب ہم خود دنیا میں نہ رہے تو اگر کسی نے ہم کو جانا تو کیا اور نہ جانا تو کیا۔ علاوہ اس کے، غور کرو کہ کہاں تک نام چلتا ہے؟ کسی آدمی سے اُس کے باپ دادوں کے نام پوچھو۔ شاید دادے تک تو سب کوئی بتا سکیگا اُس سے اوپر خود اولاد کو نہیں معلوم کہ ہمارے پردادا اور سگڑدادا کون بزرگ تھے؟ دوسرے لوگوں کو اُن کے مُردوں کی ہڈیاں اکھاڑنے کی

کیا ضرورت ہے؟

پس بالفرض نام چلا بھی تو ایک یا دو پشت۔ آگے خیر صلاح اور ایک یا دو پشت نام چلنا بھی صرف خیالی بات ہے۔

دس برس سے میں پہاڑ پر ہوں۔ ہزاروں آدمی مجھ کو جانتے ہیں اور ہزاروں کو میں جانتا ہوں لیکن نہ وہ میرے باپ کو جانتے ہیں اور نہ میں اُن کے باپوں سے واقف ہوں۔ نہ کبھی باپ کے نام بتانے یا پوچھنے کی کبھی ضرورت واقع ہوتی ہے۔

دوسری وجہ تمنائے اولاد کی یہ فائدہ ہے کہ بڑھاپے میں مددگار ہوں۔ لیکن یہ خیال بھی محض واہیات ہے۔ یہ کیونکر یقین ہے کہ اُن کے بڑے ہونے تک ہم جیتے رہیں گے؟ یا ہمارے بڑھاپے تک یہ زندہ رہیں گے؟ اور بالفرض زندگی کا اتفاق بھی ہوا تو اولاد کا مددگار ہونا محض خیالی بات ہے۔

ان وقتوں میں ہم ایسی اولاد بہت کم پاتے ہیں جن کو ماں باپ کا ادب ملحوظ ہوتا ہے۔ یا جن کو والدین کی خدمتگزاری کا خیال ہوتا ہے ادب اور خدمتگزاری تو درکنار۔ اب تو اکثر اولاد سے ماں باپ کو ایذا اور تکلیف پہنچتی ہے۔

جس اولاد کی لوگ تمنا کرتے ہیں شروع سے آخر تک اُن کے ہاتھوں سے رنج پاتے ہیں۔ جبتک چھوٹے ہیں پالنا، ایک مصیبت، آج آنکھیں دُکھتی ہیں کبھی پسلی کا دُکھ ہے۔ کبھی دانت نکلتے ہیں کبھی چیچک نکلی ہے۔ خدا خدا

کرکے بڑے ہوئے تو اُن کے کھانے کپڑے کی فکر آدمی نہیں معلوم کس حالت میں نوکر ہے یا نہیں؛ پیسہ پاس ہے یا نہیں؟ اُن کو جہاں سے ہوسکے دینا ضرور۔ ماں باپ کو فاقہ ہو تو ہو، اُن کو سودا سلف کچھ نہ ہو تو بھی دمڑی روز کے چنے چاہئیں۔ عید ہو بقرعید ہو، میلا ہو، تہوار ہو، لاڈ بھائی نیا جوڑا سودا کھانے کو، چار ٹکے پیسے۔ یہاں تک بھی غنیمت ہے۔

اب ماں باپ چاہتے ہیں کہ لڑکا کام سیکھے پڑھے اور لڑکا پاجی ایسا ہے کہ پڑھنے کے نام سے کوسوں بھاگتا ہے۔ جب تک مکتب کے چار لڑکے ٹانگ کر نہ لیجائیں، جانا قسم ہے۔ اور وہاں گیا، اُستاد کی آنکھ بچی، کہیں چورا ہے جا نکلے۔ کہیں نہر پر کھڑے گیڑیاں کھیلتے ہیں۔ کہیں بازاروں میں خاک چھانتے پھرتے ہیں اور ذرا بڑے ہوئے ماں باپ کو جواب دینے لگے لچوں کی صحبت بدمعاشوں کا ساتھ، نہ ناچ کا پرہیز ہے نہ بُری صحبت سے گریز، باپ دادوں کو بدنام کرتے پھرتے ہیں۔ اسی طرح بعضے شاطر بدمعاش چور، جواری، شراب خور ہو جاتے ہیں۔

اب اولاد بیاہنے قابل ہوئی۔ تمام شہر چھان مارا کہیں ڈھب کی بات نہیں ملتی۔ مشاطہ پاؤں توڑ توڑ کر تھکی۔ میل ملاپ والے ہار کر بیٹھ رہے کنبے کے لوگ ایک ایک سے کہہ چکے کوئی ہامی نہیں بھرتا۔ ایک خرابی میں جان ہے۔ ماں بیچاری کہیں منتیں مانتی پھرتی ہیں۔ کہیں کھڑی فال گوش لے رہی ہیں۔ کہیں گڑیا کا بیاہ ہو رہا ہے۔ پانچوں وقت دُعا ہے۔ آئی غیب سے

کسی کو بھیج۔

خدا خدا کرکے نسبت ناتا ٹھہرا تو ایسی جگہ کہ یہاں ماں بیچاری کے پاس چاندی کا تار تک نہیں۔ سدھیانے والے چھپکے بالے مانگتے ہیں کسی طرح اپنے تئیں بیچ کر بیاہ کیا "چڑیا کی جان گئی کھانے والے کو مزا نہ ملا" جہیز ہے کہ پھنکا پھنکا پھرتا ہے۔ سمدھن کہتی ہیں۔ ادئی، کیا دیا؟ ایسی نہوت میں بیٹی جننی کیا ضرور تھی؟ کوئی چیز خاطر تلے نہیں آتی بات بات میں طعنہ ہے۔

داماد صاحب جو تشریف لائے تو اُن کے دماغ نہیں ملتے جب تک سُسرے سے جوتیاں سیدھی نہ کرالیں ہاتھ تک نہیں دھوتے کھانے کی کون کہے۔

چوتھی چالے ہوئے کہ میاں بی بی میں جوتی پیزار ہونے لگی بیٹی کی بیٹی دی اور لڑائی کی لڑائی مول لی۔ پھر یہ نہیں کہ کچھ ایک دن کی ہے نہیں بس عمر بھر کو مصیبت کا چرخہ چلا۔

بیٹی کی اولاد ہونا شروع ہوئی۔ ماں بے داموں کی لونڈی۔ بے تنخواہ کی دایہ، عمر بھر اپنے بچے پالنے کی مصیبت جھیلتی رہی۔ اب خدا خدا کرکے دو برس سے آرام نصیب ہوا تھا، بیٹی کے چینگی پوٹے سنبھالنے پڑے۔

اور اگر بہو آئی تو فساد کی گانٹھ، لڑائی کی پوٹ۔ ساس کو تو جوتی کے برابر نہیں سمجھتی۔ نندوں کا دم ناک میں کر رکھا ہے۔ نہ جیٹھ کا حجاب،

نہ سُسرے کا ادب۔ عورت ہے کہ مَردوں کی پگڑی اُتارے لیتی ہے۔ خدا پناہ میں رکھے۔

بیٹے نالائق کو دیکھئے کہ بی بی نے تو یہ آفت برپا کر رکھی ہے۔ یہ مردود بی بی کی حمایت کرتا ہے اور اُلٹا ماں باپ سے لڑتا ہے۔ یہاں تک کہ بیچارے ماں باپ گھر چھوڑ الگ کرایہ کے مکان میں جا رہے۔

یہ نتیجہ اس وقت کی اولاد سے ماں باپ کو ملتا ہے بہت کم ہیں وہ لوگ جو اولاد سے راحت پاتے ہیں۔

پس ہم لوگ اپنی بیوقوفی سے اولاد کی کیا تمنّا کرتے ہیں۔ گویا آفت و مصیبت کو آرزو کرکے بُلاتے ہیں۔

اب رہا یہ خیال کہ مال و دولت کا کوئی وارث ہو، اس وجہ سے اولاد کی تمنّا کی جائے۔ یہ خیال جیسا مہمل اور پوچ اور لچر اور خرافات ہے ظاہر، جب آدمی خود دُنیا سے اُٹھ گیا تو اُس کی دولت اگر اُس کے بیٹوں نے لی تو کیا، اور اگر مال لاوارث قرار پاکر سرکار میں گیا تو کیا۔ یہ دولت عاقبت میں کچھ بکار آمد نہیں۔ مگر اُسی قدر جو خدائے تعالیٰ کی راہ میں ہم خود صرف کر جائیں یا ہمارے بعد ہمارے نام سے خدائے تعالیٰ کی راہ میں صرف ہو۔ جب ہم نے دولت کو خود صرف نہ کیا اور ایسا ضروری کام اولاد کے ذمہ چھوڑ گئے تو ہم سے زیادہ کوئی احمق نہیں۔

جو اولاد ماں باپ کا اندوختہ مفت پا جاتے ہیں ہرگز اُن کو اُس کے

خرچ کرنے میں دریغ نہیں ہوتا۔

آدمی اُسی روپے کی قدر کرتا ہے جس کو وہ خود اپنی قوّت بازو اور عرقریزی سے پیدا کرتا ہے اور بے محنت جو روپیہ ملتا ہے اُس کا حال یہی ہوتا ہے کہ "مالِ مفت دِل بے رحم"

البتہ اولاد ناچ، رنگ، سیر، تماشے میں خوب دولت کو اُڑائے گی لیکن چاہیئے کہ باپ کے نام باجرے کے دلئے پر فاتحہ تک بھی دلوائے کیا مذکور؟

کیا ایسی مثالیں دُنیا میں سیکڑوں ہزاروں نہیں ہیں کہ لوگ بخل اور خست سے عمر بھر جمع کرتے رہے، اولاد نے دولت پاتے ہی وہ گلچھرّے اڑائے کہ چند روز میں باپ کا اندوختہ عمری فنا کر دیا۔ ع

اللہ اللہ تلف کرد کہ اندوختہ بود

اس بیان سے ظاہر ہوگا کہ جس قدر تعلق اولاد کے ساتھ ہم نے اپنے دل سے بڑھا لیا ہے وہ ہمارے حق میں نہایت ضرر کرتا ہے۔ ہم کو اولاد کے ساتھ اسی قدر تعلق رکھنے کا حکم ہے کہ جب تک وہ ہماری مدد کے محتاج ہیں۔ اُن کو پرورش کریں اور اس پرورش کرنے میں بھی اس امید کو دل میں جگہ نہ دیں کہ اولاد بڑی ہو کر اس پرورش کے عوض کبھی ہماری خدمت کرے گی۔ یہ اُمید کرنا سخت درجے کی نادانی ہے۔ بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ خدا نے جو ہمارا مالک ہے، اُن کے پالنے کی

خدمت ہم سے متعلق کی ہے۔ ہم اولاد کو پالنے میں اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ یہ باغ خدا کا ہے۔ ہم اس کی طرف سے اس باغ کے مالی ہیں۔

"اگر باغ کا مالک کسی درخت کے قلم کرنے یا کاٹ ڈالنے کا حکم دے مالی کو یہ کہنے کا کب منصب ہے کہ میں نے اس درخت کو بڑی محنت سے پالا ہے، یہ کیوں کاٹا اور قلم کیا جاتا ہے"؟۔

دُنیا کے تمام تعلقات صرف اتنے واسطے ہیں کہ آدمی ایک دوسرے کو فائدہ پہنچائے۔ ہم چند روز کے واسطے کسی مصلحت سے اس دُنیا میں بھیجے گئے ہیں اور یہاں ہم کو کسی کا باپ کسی کا بیٹا کسی کا بھائی بنا دیا ہے۔ اس واسطے کہ لوگ ہماری اور ہم لوگوں کی مدد کریں اور صلحکاری اور سازگاری میں اپنی زندگی جو مقرر کر دی گئی ہے پوری کر جائیں۔ دُنیا ہمارا گھر نہیں ہے۔ ہم کو دوسری جگہ جا کر رہنا ہوگا۔ نہ کوئی ہمارا ہے نہ ہم کسی کے۔ ہم اگر کسی کے باپ ہیں تو صرف چند روز کے واسطے۔ اور اگر کسی کے بیٹے ہیں تو بھی چند روز کے واسطے۔

اگر ہم کسی کو مرتا دیکھیں تو افسوس کی کیا بات ہے، افسوس تو جب کریں جب ہم یہاں بیٹھے رہیں۔ ہم کو خود ہی سفر درپیش ہے۔ نہیں معلوم کس گھڑی بُلاوا ہو، چلنا ٹھہر جائے۔ پھر سب سے مشکل یہ ہے کہ مرنا صرف یہی نہیں ہے کہ بدن سے جان نکل گئی گویا روح ایک مکان سے

دوسرے مکان میں چلی گئی۔ نہیں، وہاں جاکر بات بات کا حساب دینا ہوگا۔ زبان جھوٹ اور غیبت اور قسم اور فحش اور بیہودہ بکواس وغیرہ کی جواب دہی کرے گی۔ آنکھ نظر بد کی سزا پائے گی۔ کان کو کسی کی بدی، جھوٹ، راگ سننے کے عوض میں گوشمالی دی جائے گی۔ ہاتھ نے کسی پر زیادتی کی ہے یا پرایا مال چرایا ہے، کاٹا جائے گا۔ پانوں اگر بے راہ چلا ہے شکنجے میں کسا جائے گا۔ بڑا ٹیڑھا وقت ہوگا، خدا ہی اپنے فضل سے بیڑا پار کرے تو ہو سکتا ہے۔

جس کو ان باتوں سے فراغت ہو وہ کسی کے مرنے پر غم کرے یا کسی کے پیدا ہونے پر خوش ہو تو بجا ہے لیکن دنیا میں کوئی ایسا ہے جو اپنی عاقبت سے بے فکر ہو چکا ہو؟

اصغری! اپنی خبر لو اور اس دن کے واسطے سامان کرو جہاں سوائے عمل نیک کے کچھ کام نہ آئے گا اور دعا کرو کہ خداوند عالم اپنے دوست محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل سے ہم سب کا انجام بخیر کرے۔ آمین۔ والدعا

گنہگار

دُور اندیش خاں

خاتمۃ الطبع

الحمدللہ علی احسانہ کہ یہ کتاب لاجواب فیض انتساب پسند خاطر اولی الالباب ہر دل مانوس یعنی مراۃ العروس طبع ہو کر بفیض رسان عروسان عالم ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب شمس العلماء مولوی حافظ نذیر احمد صاحب مرحوم (ایل، ایل، ڈی) کی ایسے دور کی تصنیف ہے جبکہ تعلیم نسوان کا رواج کم تھا۔

ظاہر ہے کہ مختصر سی تعلیم سے عورتوں کے توہمات اور جہالت اور کجرائی کی اصلاح کرنا آسان کام نہ تھا لہٰذا اس خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے مولوی صاحب موصوف نے ایک قصہ کا منصوبہ دو فرضی ناموں سے باندھا اور اس کو اتنا دلچسپ، مہذب اور نصیحتوں سے لبریز کر دیا جس سے ہر طبقہ کی لڑکیاں پڑھنے کی شائق ہو گئیں۔

مولوی صاحب موصوف نے **اصغری و اکبری** کے قصہ کے پیرایہ میں مستورات کو مہذب، سلیقہ شعار، ہنرمند بنانے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا اس سے ان کو نہ صرف تعلیم ہی کا شوق پیدا ہوگا بلکہ امور خانہ داری وغیرہ میں بھی وہ مکمل معلومات حاصل کر لیں گی۔

اس افادیت کے زیرنظر قبل ازیں یہ کتاب باجازت مصنف عالی منزلت اکیس مرتبہ نولکشور پریس میں ہزاروں کی تعداد میں طبع ہوکر ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگئی۔

اب بائیسویں بار حسب ایمائے کنور تیج کمار صاحب بھارگو منیجنگ ڈائرکٹر مطبع تیج کمار (پرائیویٹ) لمیٹڈ وارث مطبع منشی نولکشور واقع لکھنؤ میں باہتمام ایم۔ ڈی مصرا سپرنٹنڈنٹ باہ ارتق ۱۹۷۰ء طبع ہوکر نذر شائقین ہوئی